© rasailojaraid.com

تعارفِ کتب

(عبدالحمید)

[پچھلے شمارہ میں "مطبوعات" کے تحت ہم دو کتابوں کا تعارف پیش کر چکے ہیں۔ یہ کوشش بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے]

Civilization on Trial (تہذیب دورِ ابتلا میں[1]) مصنفہ :- ارنلڈ جے ٹائن بی (Arnold J. Toynbee) ۲۶۳ صفحات۔

اِس کتاب کا مصنف دورِ جدید میں تاریخ انسانی کا ایک عظیم المرتبت عالم ہے۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "مطالعۂ تاریخ" (A Study of History) جس کی ابھی چھ جلدیں منظرِ عام پر آئی ہیں، ہر صاحبِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ کسی کو مصنف کے خیالات سے اتفاق ہو یا اختلاف، مگر یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ پروفیسر موصوف ایک گہرے اور ٹھوس مطالعے کے ساتھ نہایت ہی پختہ اور سلجھا ہوا فکر بھی رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب (تہذیب دورِ ابتلا میں) مصنف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو اس نے مختلف اوقات میں ایک ہی نصب العین کے تحت لکھے مگر نصب العین کی عینیت نے اُنہیں ایک وحدت میں سمو دیا ہے۔

اس کتاب کا تعارف پیش کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس مفکر کے اساسی تصورات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیں تاکہ اس کے مباحث کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

مطالعۂ تاریخ کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اُس نے بتایا ہے کہ تاریخ پر غور و فکر کرتے وقت ہماری توجہ صرف حکومت، یا ریاست کے ظاہری ڈھانچے پر ہی مرکوز نہیں ہونی چاہیے

---

[1] اس کا لفظی ترجمہ "تہذیب آزمائش میں" ہونا چاہیے، مگر چونکہ یہ مصنف کے اصل مدعا کے اظہار کے لیے ناکافی ہے اس لیے ہم نے اس میں تھوڑا سا تصرف کر کے اسے اس طرح ڈھال لیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانیت کے ارتقاء کا اس طرز پر مطالعہ کریں کہ ازل و ابد کی طنابیں کھنچ جائیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"مطالعۂ تاریخ کا اصل میدان سماج اور معاشرت ہیں کیونکہ ان کی حدود قومی ریاستوں یا سیاسی دھڑے بندیوں سے کہیں زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔ لہٰذا تاریخ کے طلبہ کو ریاستوں سے زیادہ مختلف طرز ہائے معاشرت پر سوچ بچار کرنا چاہیے" (مطالعۂ تاریخ صفحہ ۳۵)

اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم جغرافیائی حدود سے نکل کر انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کریں اور قوموں کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوار معاشرت۔ الغرض قومی زندگی کے ظاہری ملبوسات پر غور کرنے کی بجائے اُس روح تک پہنچنے کی کوشش کریں جو ان میں متجلی ہے۔ اس روح کو نہ تو نسلی عوامل اور نہ جغرافیائی ماحول پیدا کرتا ہے بلکہ یہ حالات کی تحدی (Challenge) اور اس کے ردِ عمل (Response) کے اتصال سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اسی بنا پر وہ تہذیبوں کی تکرار کا بھی قائل ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جنگ اور طبقہ واریت پہلی تہذیب کے معرضِ وجود میں آتے ہی دنیا میں نمودار ہوئیں اور یہ دونوں آج تک انسانیت کے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ وہ بیس تمدن جن سے مغربی مورخین اسوقت آشنا ہیں ان سب کو انہی کے بے رحم ہاتھوں نے مٹایا۔ تہذیبیں بلا شبہ مٹتی رہی ہیں مگر ان کے مدفن میں ان کی تہذیبی روح فنا نہیں ہوتی۔ جب وہ ایک قوم کے قالب کو چھوڑتی ہے تو کسی دوسری قوم کو اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔"

مگر اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ پروفیسر ٹائینبی کا نظریۂ تکرار نیٹشے (Neitzche) کے "ابدی تکرار" (Eternal Recurrence) کے نظریے سے بہت مختلف ہے۔ نیٹشے کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا میں توانائی (Energy) محدود ہے اس بنا پر اس کے نزدیک اس کائنات میں کسی تغیر کی گنجائش نہیں۔ یہی وہ اصل بنیاد تھی جس کی بنا پر علامہ اقبال مرحوم نے اس کے نظریہ کو ایک غیر متغیر اور اندھی میکانیت (Mechaniam) سے تعبیر کیا۔[1] پروفیسر ٹائینبی تکرار کا تو

[1] The Reconstruction of Religions thought in Islam P. 115

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائل ہے مگر سپینگلر کی طرح اس میں جبریت کا قائل نہیں۔ اُس نے اپنی کتاب "مطالعۂ تاریخ" میں اس امر کو واضح کیا ہے کہ تہذیبوں کی تکرار کو کسی پہیے کے چکر کاٹنے پر قیاس کر لینا سخت نادانی ہے۔ جب تہذیبیں بن کر مٹتی اور مٹ کر بنتی ہیں تو اس طرح وہ بہت سی نئی اقدار کو بھی جنم دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے :-

"ایک گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسانی عمل کی حد تک تاریخ نے اپنے آپ کو کئی بار دُہرایا ہے مگر یہ تکرار ماحول کی تسخیر کا نتیجہ ہے۔ اور یہ تسخیر تخلیقی صلاحیتوں کے بغیر کسی صورت بھی ممکن نہیں"

انسانی تہذیب کے عروج اور بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس میں نہ صرف ماحول کی تحدی (Challenge) کو قبول کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو بلکہ اس میں اس کا منہ توڑ جواب دینے کی بھی بے پناہ قوت پائی جائے۔ یہ قوت انسان کے اندر تخلیق کے شوق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے غیر مطمئن ہو اور نئے حقائق کی تکوین کے لیے اپنے اندر گوناگوں اضطراب محسوس کرے اس وقت اُس کے اندر یہ قوت اُبھرتی ہے کہ وہ حقیقتِ حاضرہ کے خلاف بغاوت کر کے ایک ایسی دنیا آباد کرے جس میں اُس کی مچلی ہوئی تمناؤں اور بے قرار کرنے والے خوابوں کی تعبیر ہو سکے۔ اسی بے چینی میں انسانی ترقی کا راز نہاں ہے۔ ایک قوم اس وقت تک ترقی کرتی ہے جب تک کہ اُس میں تخلیقی قوت رکھنے والے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود رہتی ہے۔ مگر جب ان اشخاص کے اندر یہ صلاحیت ختم ہو جائے اور وہ محض قوت کے بل پر حکمراں رہنے کے متمنی ہوں تو اس وقت ان پر زوال آجاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ کوئی سماج مجرد قوت کے سہارے زیادہ دیر تک دنیا میں سر بلند نہیں رہ سکتا۔

اسی نظریہ سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ کوئی قوم دوسروں کی نقال بن کر دنیا میں عزت و جاہ حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کے اندر تخلیقی قابلیتیں اسی وقت پروان چڑھتی ہیں جبکہ وہ از خود ماحول کے حملے کے سامنے سینہ سپر ہوں۔ نقالی سے یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوت افسردہ ہی نہیں بلکہ بالکل مُردہ ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے سامنے اسلامی ممالک کی مثال موجود ہے۔ ترکوں پر جب دورِ انحطاط آیا تو ان کے اندر غور و فکر کی صلاحیتیں بھی ختم ہوگئیں۔ وہ بجائے اپنی کمزوریوں پر غور کرنے کے یہ سمجھ بیٹھے کہ اُن کے زوال کا اصلی سبب اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی پیروی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کی آغوش میں پناہ لی۔ مگر اس معاملہ میں بھی وہ اتنے "مومن" نہ بن سکے کہ اُس کی تخلیقی روح کو اپنے اندر جذب کر سکیں۔ اس ناکامی کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سے ترکوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی بلکہ دنیا میں پہلے سے بھی زیادہ ذلیل اور خوار ہو گئے۔ دنیا کی سیاست میں جو مقام اُنہیں حاصل ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

کتاب کے ایک باب میں جس کا عنوان "اسلام، مغرب اور مستقبل" ہے، فاضل مصنف نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اگر مغربی دنیا مستقبل قریب میں اپنے تعصبات کو ترک کر کے ایشیا کی راہنمائی کو تسلیم کرنے پر تیار ہو جائے تو پان اسلامزم (Pan-Islamism) کی تحریک اُسے نیشنلزم کی آفت سے بچا سکتی ہے۔

پروفیسر موصوف مملکت کے ہمہ گیری کے دعوے کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ مملکت مقصود بالذات نہیں بلکہ محض اعتباری اور مجازی طور پر متقدر ہے۔ اس لیے اس میں الوہیت کی شان پیدا کرنا وہ عقلِ سلیم کے منافی خیال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:-

> "جب ہم یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ فرد کا وجود صرف سماج کے لیے ہے تو اس سے انسانی زندگی کا کعبۂ مقصود ہی بدل جاتا ہے۔ اس کے مطابق انسانی زندگی میں سب سے اہم اور ضروری چیز افراد کی نشوونما نہیں بلکہ قومی اقتدار میں اضافہ ہے۔ یہ نقطۂ نظر کسی طرح بھی درست نہیں اگر اسے صحیح مان کر اس کے مطابق عمل کیا جائے تو اس سے انسان نہایت ہی گھٹیا اخلاق کا مظاہرہ کرے گا۔ یہ تصور کہ فرد سماج کا ایک بے جان حصہ ہے کپڑوں کے ٹکڑوں کے متعلق تو درست مانا جا سکتا ہے مگر اس کا انسانوں پر اطلاق بہت بڑی جہالت ہے جب ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرد اپنی انفرادیت کو تحلیل کر کے اُسے سماج میں گُم کر دیتا ہے تو اُسی سے انسان اور فرد کے باہمی تعلقات کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ انسان پھر خدا کی بجائے قوم کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔"

مصنف کو مغربی تہذیب کی ناکامی کا بھی پورا اعتراف ہے اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ موجودہ تمدن کی شاندار عمارت جس بنیاد پر اٹھائی گئی ہے وہ صرف علم صنعت و حرفت (Technology) ہے۔ اور یہ اپنی ساخت کے لحاظ سے سخت کمزور ہے۔ اس لیے موجودہ انسان ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہے۔ ایک طرف انسانی حقوق کے بڑے ہی دلربا نعرے ہیں مگر دوسری طرف جنگ و قتال، قوم پرستی اور نسل پرستی انسانیت کو فنا کر رہی ہیں۔ یہ تضاد مختلف قوموں اور ملکوں کے اندر ہی دکھائی نہیں دیتا بلکہ یہ ایک ملک کے رہنے والے باشندوں، ایک قوم کے مختلف افراد اور ایک فرد کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پیداوار میں بے شمار اضافہ ہوا مگر اس کے ساتھ ہی فاقہ مستوں اور حاجتمندوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ ہم نے مشینوں سے کام لینا سیکھا تاکہ وقت کی بچت ہو اور اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کر سکیں، لیکن ہماری یہ تمنا، تمنا ہی رہی۔

مغربی تہذیب کی ناکامی کو جس طرح اس مفکر نے محسوس کیا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اس کے ایک مضمون[1] بعنوان "تاریخ جدید انسان کو تنبیہ کرتی ہے" (The History warns modern man) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ہم یہاں اس کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں:-

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤ یہاں تک بڑھا دیا ہے کہ اس کے بنک اکاؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے جا چکے ہیں۔ تعطل بڑا خطرناک ہو رہا ہے۔ وہ ہر لمحہ یہی سوچتا ہے کہ اب جیتا مگر اُسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر ہرگز بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے بل پر اس کی کامیابی یقینی ہو۔"

"وہ علمائے اجتماعیات اور معالجینِ نفسیات سے دریافت کرتا ہے" تم ہمیں کب تک

[1] یہ مضمون دراصل ایک انگریزی جریدہ World Review میں مارچ سنہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک صالح معاشرہ بہم پہنچا سکو گے؟ کیا ہمیں تباہی سے بچانے کے لیے اس کا انتظام بروقت ہو جائے گا۔ پھر جب وہ اسے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے تو مجھ ایسے تاریخ دانوں سے سوال کرتا ہے: "جس نوعیت کی الجھن میں انسانیت آج گرفتار ہے اس کے پیشِ نظر آخر تاریخ کا انجام کیا ہوگا؟ کیا واقعی انسانیت کبھی پہلے بھی ایسی مصیبت میں پھنسی ہے جس میں آج ہم مبتلا ہیں۔ ہاں! بارہا! جدید علم حرفت کی وجہ سے اگر ہم کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں تو واقعہ یہی ہے۔ انسان نے پچھلی صدیوں میں اسی طرح تاش کے پتے اپنے ہاتھ میں لیکر قمار بازی کی ہے جو ہم سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ مگر گزشتہ زمانوں میں داؤں اس قدر بھاری نہ تھے"

"فنی کمالات بجائے خود حکمتِ بعمل کے ضامن نہیں ہو سکتے! اگرچہ موجودہ انسان ان پر بڑا نازاں ہے۔ ہم اپنی صنعتی ترقی سے اس قدر مسحور ہیں کہ شاید ہم ان وسیع تر تخلیقی اقدامات کو عمل میں لانے سے قاصر رہ جائیں"

"تمام عظیم الشان فیصلے ہمیشہ اخلاقی فیصلے ہوتے ہیں۔ فنی صلاحیتیں تو خیر و شر دونوں کے لیے یکساں کارآمد ہیں۔ کسی نہ کسی کو یہ طے کرنا ہے کہ ہونا کیا چاہیے! آپ اخلاقی فیصلوں سے بچ نہیں سکتے"

بات کچھ طویل ہو گئی ہے مگر زیرِ نظر کتاب کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کے لیے "مطالعۂ تاریخ" اور اس مضمون کے چند اقتباسات پیش کرنا ناگزیر تھے۔ اس مصنف کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری ہے۔ جو لوگ مطالعہ کا کچھ ذوق رکھتے ہوں انہیں اس کے افکار کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر مطالعے کی ترتیب یوں رکھی جائے تو بہتر ہوگی۔ سب سے پہلے اس کے اس مضمون "تاریخ انسان کو متنبہ کرتی ہے" کو دیکھا جائے۔ اس کے بعد زیرِ نظر کتاب "تہذیب دورِ ابتلا میں" اور سب سے آخر میں "مطالعۂ تاریخ"۔ جو لوگ چھ مجلدات کے مطالعے کا صبر آزما کام نہ کر سکیں ان کے لیے ڈی۔ سی سومرویل (D. C. Somervell) نے ایک ملخص بھی پیش کیا ہے وہ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ بہر حال دورِ حاضر کے غلط نظریات کو سمجھنے کے لیے اس مصنف کے خیالات سے آگاہ

© rasailojaraid.com